(غلام گردش)

آٹھ آنے

بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ لائل پور کا ڈویژنل پبلک سکول ابتدائی ادوار میں صرف ایک کوٹھی میں محدود تھا۔ساٹھ کی دہائی میں بھی، سکول ایک بہترین مقام حاصل کر چکا تھا۔ذہن میں پرانے سکول کا دھندلا سا خاکہ موجود ہے۔یہ کوٹھی جیل روڈ کے تقریباً آخری کونہ میں تھی۔ایک دن، سکول ٹیچرز نے سب بچوں کی لائن بنوائی۔قطعاً معلوم نہیں تھا کہ کہاں جا رہے ہیں۔گمان ہے کہ تین چار سو بچے اور بچیاں تھیں۔قطار میں تھوڑی دور چلے تو ایک بہت بڑی جگہ آ گئی۔اس میں وسیع وعریض گراؤنڈ اور بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔خیال تھا کہ ہم لوگ پیدل چلتے چلتے کسی دوسری دنیا میں آ گئے ہیں۔اکثر بچوں کا گمان تھا کہ یہ کوئی نیا شہر ہے۔بے حد خوبصورت اور دیدہ زیب جگہ ہمارے سکول کی نئی جگہ تھی۔ایک بھرپور عمارت اور حدِ نظر تک سبزہ ہی سبزہ۔جن لوگوں نے سکول بنوایا تھا، اس شہر پر ایک عظیم احسان تھا۔عجیب بات کرنا چاہتا ہوں۔اتنے عظیم ترقیاتی منصوبے کیلئے کسی جگہ پر شکریہ کے بینر نہیں لگے ہوئے تھے۔ہماری موجودگی میں اسکی کوئی افتتاحی تقریب بھی نہیں ہوئی تھی۔شائد پہلے وقتوں کے سرکاری ملازمین اور سیاستدان کام کی عظمت کو جانتے تھے۔سستی شہرت سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔قریبی دوست، ارشد چودھری نے ایک دن بتایا کہ یہ فقید المثال سکول کس کس نے محنت سے بنوایا۔تمام نام بھول چکا ہوں۔مگر ان لوگوں کا احسان ہرگز نہیں بھولا۔

جونیئر سکول میں حد درجہ نظم وضبط تھا۔لیڈی ٹیچر اور ہیڈ مسٹرس دیکھ کر جان نکل جاتی تھی۔طویل قامت مسز خان، ساڑھی پہن کر انتہائی تہذیب سے چلتی ہوئی آتی تھیں تو بچے اور بچیوں کو سانپ سونگھ جاتا تھا۔خاموشی سے اپنے کام میں مشغول ہو جاتے تھے۔مگر کن انکھیوں سے نظریں مسز خان پر ہی جمی ہوئی تھیں۔بالوں کا ایک بڑا سا جوڑا باندھ کر سکول آتی تھیں، اس سے انکا قد مزید بڑا لگتا تھا۔بنیادی طور پر وقار اور توازن کا استعارہ تھیں۔یہی حال دوسری ٹیچرز کا بھی تھا۔میڈم طلعت ہماری کلاس کو پڑھاتی تھیں۔دبلی پتلی لیکن انتہائی زبردست خاتون۔پڑھانے میں انکا کوئی ثانی نہیں تھا۔سوچتا ہوں تو گمان ہوتا ہے کہ یہ بڑے لوگ کسی اور سیارے کی مخلوق تھے۔بے غرض اور بے لوث فرشتے۔مسز چوہدری جو ہماری ہیڈ مسٹرس تھیں، انکا بھی یہی حال تھا۔جونیئر سیکشن کے چار پانچ برس کیسے گزرے، معلوم ہی نہیں ہوا۔جب 1965 کی جنگ ہوئی تو ہم سارے جونیئر سکول میں تھے۔بریک کے وقت کھیلتے ہوئے، اوپر سے فضائی جنگی جہاز تیزی سے گزرتے تھے۔ہلکے نیلے رنگ کے یہ ہوائی جہاز پاکستان ائیر فورس کے تھے۔جب کوئی جہاز فضا کو چیرتا ہوا گزرتا تھا، بچے تالیاں بجانی شروع کر دیتے تھے۔ایسے لگتا تھا کہ کوئی کھیل ہو رہا ہے۔ہرگز معلوم نہیں تھا کہ جنگ کیا ہوتی ہے۔ہندوستان کدھر ہے۔سکول کے بعد اگر ہوائی جہاز فضا میں چکر لگا رہا ہوتا تھا، تو اکثر لوگ چھتوں پر کھڑے ہو کر تالیاں بجانی شروع کر دیتے تھے۔جنگ کتنی ظالم ہوتی ہے معلوم ہی نہیں تھا۔ذہن میں کسی کے خلاف کوئی کدورت نہیں تھی۔حیرت انگیز حد تک اچھی زندگی تھی۔

جب سینئر سیکشن گئے تو کیمرج کے فارغ التحصیل اصغر چوہدری پرنسپل تھے۔غالباً 67 کی بات ہے۔کیا انسان تھا۔کالا گاؤن اور سوٹ میں ملبوس شخص ایک جادوگر نظر آتا تھا۔تعلیمی جادوگر۔بالکل انگریز۔کہتے تھے کہ اچھے سکول کی چھاپ طلباء پر ایسی ہونی چاہیے، کہ

صرف چال وڈھال سے ہی انہیں پہچان لیا جائے۔سڑک پر چلتے ہوئے بھی اپنے سکول کی روایات کا خیال کرنا چاہیے۔ جہاں کھڑے ہوتے تھے، بچے انکے اردگرد جمع ہو جاتے تھے۔اس شخص کی طلباء سے اُنسیت دیکھیے ۔ یہ بھی چیک کرتے تھے کہ بچے کے ناخن ترشے ہوئے ہیں کہ نہیں۔کانوں میں میل تو نہیں ہے۔انکی اہلیہ انگریز تھی۔اکثر سکول میں اپنے بیٹے کے ساتھ سائیکل چلاتی ہوئی نظر آتی تھیں۔بہرحال سینئر سیکشن ایک جہانِ حیرت تھا۔بریک میں اساتذہ تمام طالبعلموں کو میس لیکر جاتے تھے۔وہاں لازم تھا کہ بچے دودھ پیے نگے۔دودھ کی خوشبو آج تک یاد ہے۔لباس، چال سے لیکر صحت تک کا خیال کیا جاتا تھا۔سائیکل سٹینڈ کے سامنے ایک کینٹین تھی۔بہت بڑا کمرہ نہیں تھا۔چار آنے کی کوک کی بوتل اور شائد چار آنے کا چپس کا پیکٹ ملتا تھا۔کینٹین، بریک میں طلباء سے لبریز ہوتی تھی۔کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ہر بچے کی کوشش ہوتی تھی کہ آٹھ آنے جتنی خطیر رقم میں بوتل اور چپس لینے میں کامیاب ہو جائے۔جیسے ہی بریک ختم ہونے کی گھنٹی بجتی تھی، سب واپس کلاسوں میں بھاگ کر آ جاتے تھے۔ ہفتہ میں کئی بار، بریک میں ایک جنگ ہوتی تھی۔دو تین بچے، ایک چھوٹے سے چبوترے پر چڑھ جاتے تھے۔پھر اسکی حفاظت شروع کر دیتے تھے۔باقی پانچ چھ بچے اس ٹیلے کو فتح کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے تھے۔حفاظت کرنے والوں کے پاس ایک ہی ہتھیار ہوتا تھا۔بیلٹ اُتار کر چابک کی طرح استعمال کرنے لگتے تھے۔دس منٹ کی جنگ میں ویسے کوئی بھی زخمی نہیں ہوتا تھا۔ایسی لڑائی ہوتی تھی جس میں کوئی بھی فاتح یا مفتوح نہیں تھا۔دس منٹ بعد سب کچھ بھول کر دوبارہ دوست بن جاتے تھے۔آج کی طرح نہیں کہ دلوں میں ایک دوسرے کیلئے صرف اور صرف نفرتیں اور کدورتیں ہیں۔آج کل اگر کوئی کامیاب ہے تو اسکی ٹانگیں کھینچنے بلکہ کاٹنے کیلئے ہر دوسرا انسان تیار ہے۔منافقت اس درجہ ہے کہ احترام اور عزت صرف اور صرف منہ پر ہے۔جیسے ہی کسی نے رخ موڑا اور اُٹھا فوراً اسکی شدید برائیاں شروع ہو جاتی ہیں۔بہرحال سینئر سیکشن میں قطعاً کوئی ایسا منفی جذبہ موجود نہیں تھا۔تعلیمی معیار تو اپنی جگہ۔مگر ہنر کی عزت کروانے کا بھی نایاب طریقہ اپنایا گیا تھا۔ہفتہ میں ایک گھنٹے کا خصوصی پیریڈ ہوتا تھا۔اس میں ایجوکیشنل بلاک سے منسلک ایک ورکشاپ میں کام کرنے کی تربیت دی جاتی تھی۔کوئی آری سے لکڑی چیرتا تھا اور کوئی لوہے سے کوئی چھوٹا سا ماڈل بنا رہا ہوتا تھا۔بالکل اسی طرح کیاریوں میں پودے لگانے کی تربیت دی جاتی تھی۔مقصد، اپنا کام خود کرنے کی اور ہنر کو اپنے اندر سمونے کی تربیت تھی۔کیاریوں میں پودے لگانے کی تربیت کا کم از کم مجھے بہت فائدہ ہوا۔آج تک جس ضلع یا ڈویژن میں گیا ہوں، کسی نئی سرکاری رہائش گاہ میں منتقل ہوا ہوں، ہر جگہ پہلا کام نئے پودے لگوانا ہوتا ہے۔سکول کی ابتدائی تربیت نے قدرت کے بے حد نزدیک کر دیا ہے۔ویسے اب تو ایسے لگتا ہے کہ ہر انسان ایک خودرو پودا ہوتا ہے۔اچھی تعلیم اسکو تراش کر خوبصورت درخت بنانے کی کوشش کرتی ہے۔لیکن اگر انسان معیاری تعلیم حاصل نہ کر سکے تو ایک جھاڑی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔جسکا نقصان اسکے فائدے سے بہت کم ہے۔

سکول آنے جانے کیلئے اکثریت بچے سائیکل استعمال کرتے تھے۔ہمارے گھر کا ایک ملازم محمد علی، ملازم نہیں بلکہ فرد اپنی سائیکل پر سکول چھوڑنے جاتا تھا۔کیریئر پر منور بھائی بیٹھتے تھے اور سائیکل کے ڈنڈے پر میں بیٹھتا تھا۔والد صاحب کے پاس کار تھی، جس پر وہ کچہری جایا کرتے تھے۔گاڑی میں بیٹھنے کا موقع کم ملتا تھا۔ہاں، جب کسی جگہ جانا ہوتا تھا تو سارے بچے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاتے

تھے۔غفار ڈرائیور گاڑی چلاتا تھا۔والد صاحب نے پہلی گاڑی خریدی تو اسکا سائز قدرے بڑا تھا۔جناح کالونی والے گھر میں کھڑا کرنے کی جگہ نہیں تھی۔لہذا والد صاحب نے گھر سے بہت تھوڑے فاصلے پر ایک گیراج لیا ہوا تھا۔غفار ڈرائیور وہاں گاڑی کھڑی کرتا تھا اور وہیں سے گھر لیکر آتا تھا۔کچھ کچھ یاد ہے،شیورلٹ گاڑی تھی،سفید رنگ کی۔سٹارٹ کرنے کا بھی عجیب سا طریقہ تھا۔غفار ایک بڑے ہینڈل سے گاڑی کے انجن کے سامنے لگے ہوئے کسی پرزے کو گھماتا تھا اور ایک دو منٹ میں گاڑی سٹارٹ ہو جاتی تھی۔اس زمانے میں چابی سے سٹارٹ ہونے والی گاڑیاں نہیں آئی تھیں۔بہرحال گاڑی میں سفر کرنے کا کوئی شوق ہی نہیں تھا۔شوق صرف اور صرف ایک تھا کہ کسی طریقے سے ایک ذاتی سائیکل مل جائے۔اُمید نہیں تھی کہ سکول میں پڑھتے ہوئے اتنی بڑی تمنا پوری ہوگی۔ساتویں کلاس میں تھا تو ایک دن والد صاحب نے بلا کر کہا کہ فلاں دکان پر جاؤ اور سائیکل لے لو۔یقین نہیں آرہا تھا۔اس دکان پر گیا اور سہراب سائیکل لی۔اسکے مختلف حصوں پر کاغذ کا گتہ چڑھا ہوا تھا۔بڑے شوق سے ہینڈل پر گھنٹی لگوائی۔جب گھر آرہا تھا تو مسلسل گھنٹی بجاتا رہا۔جتنی خوشی اپنی سائیکل ملنے پر ہوئی تھی،اتنی خوشی 1984 میں ذاتی گاڑی ملنے پر بھی نہیں ہوئی۔

سکول میں حساب کے ٹیچر مشتاق صاحب تھے۔انتہائی شفیق انسان۔کالے گاؤن میں ایک لکڑی کا فٹا چھپا کر رکھتے تھے۔کوئی طالبعلم غلطی کرتا تھا تو کافی زور سے فٹا ہاتھوں پر مارتے تھے۔ویسے مجھے بغیر غلطی کے بھی مارتے تھے۔ایک دن ہمت کر کے پوچھا تو کہنے لگے کہ تم کلاس میں فسٹ آتے ہو۔حساب بھی ٹھیک سیکھ چکے ہو۔مگر فٹے سے اس لیے مارتا ہوں کہ مزید پڑھوں اور بہت زیادہ ترقی کروں۔یقین فرمایئے۔اب مشتاق صاحب کی باتیں یاد کرتا ہوں تو آنکھوں میں بادل آجاتے ہیں۔ہر اُستاد کی کوشش ہوتی تھی کہ اسکی کلاس کے بچے آگے سے آگے بڑھیں۔ترقی کے میدان میں سب کو پیچھے چھوڑ دیں۔یہی ہوا۔اس سکول سے ہر طرف بہترین اور کامیاب انسان نکلے۔جو جس بھی شعبہ میں گیا،کمال کر گیا۔سول سروس،پولیس،کاروبار،ڈاکٹر،انجینئر،آرکیٹیکٹ،ہر شعبہ میں ان بچوں نے نام پیدا کیا۔

اب سوچتا ہوں تو عجیب سا لگتا ہے۔ہر طرف نفسانفسی،جعلی اور دھرے معیار،خلوص کا مکمل فقدان اور جھوٹ کی نگری نظر آتی ہے۔پیسے کیلئے بھائی بھائی کا گلہ کاٹ رہا ہے۔بچے اپنے والدین کو اے ٹی ایم کارڈ سمجھتے ہیں۔اچھے دوستوں کا قحط پڑ چکا ہے۔ہر انسان دوسرے کیلئے ناصح اور مبلغ کا کردار ادا کر رہا ہے۔اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی طرف کوئی نہیں دیکھتا۔پتہ نہیں۔سکول کا زمانہ خواب تھا یا اب خواب دیکھ رہا ہوں۔حقیقت کیا ہے۔معلوم نہیں۔پبلک سکول کی کینٹین بھی شائد کوئی وہم تھی،جس میں آٹھ آنے میں ہر چیز مل جاتی تھی۔پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو وقت کی پگڈنڈی پر ایک سہانا سا طلسمی دور تھا،جو گزر گیا،رُکا نہیں یا شائد کبھی آیا ہی نہیں!

راؤ منظر حیات